احمد حسن شیخ

چند یادیں، چند تاثرات، یومِ آزادی کے حوالے سے

شیخ صاحب نے ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں دلی میں آل انڈیا ریڈیو کی سنٹرل نیوز آرگنائزیشن میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ پاکستان بنا تو opt کر کے یہاں آ گئے۔ ۱۹۶۴ء تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے اور اس دوران کوئٹہ، ڈھاکہ، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں نمائندے کی حیثیت سے تعینات رہے۔

۱۹۶۴ء میں جب مرکزی انفارمیشن سروس وجود میں آئی تو پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں آ گئے۔ تین حکومتوں میں یعنی جنرل یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے ساتھ پریس چیف رہے۔ وزیراعظم جونیجو نے انہیں اپنا speech writer بنا لیا اور ان کی مشہور تقریریں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انہیں کے نوکِ قلم سے نکلیں، وزیراعظم نواز شریف نے انہیں اپنا media consultant مقرر کیا۔ ایک سال انہی کے دور میں PTV کے Managing Director بھی رہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اُردو اور انگریزی میں اُن کے مضامین نوائے وقت، جنگ، ڈان، نیشن اور مسلم میں چھپتے رہے۔ شیخ صاحب نے طالب علمی کے زمانے میں اور دلی کی ملازمت کے دوران تحریکِ پاکستان کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔

کتابوں میں اکثر سنجیدہ اور اہم واقعات و حالات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن باتوں کو یہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیرضروری اور معمول کی باتیں ہیں وہی کبھی کبھی اصلی تصویر کی بہتر عکاسی کرتی ہیں۔

جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں اُن کا یا تو میں خود شاہد ہوں یا میں نے ان لوگوں کی زبانی سُن رکھا ہے جنہیں میں ذاتی طور پر قریب سے جانتا تھا۔

میں آپ کو تحریکِ پاکستان سے بھی پہلے کے زمانے میں لیے چلتا ہوں، شروع مَیں اپنے تعلیمی سفر سے کروں گا۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے جب میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، اس وقت ماحول ایسا تھا کہ سیاست کے میدان میں کوئی گرمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہندو اور مسلمان عمومی طور پر باہمی آویزش کا شکار نہیں تھے۔ میرا تعلق بھارتی پنجاب کے شہر فاضلکا ضلع فیروز پور سے ہے، ہمارے ہاں ایک اسلامیہ ورنیکلر مڈل سکول اور ایک گورنمنٹ ہائی سکول لڑکوں کا تھا، اسلامیہ سکول شہر کے ایک کونے میں اور گورنمنٹ سکول دوسرے کونے میں واقع تھا۔ اسلامیہ سکول کے گرد ونواح میں کچھ زراعت پیشہ سکھوں کے گاؤں تھے جہاں سے چند سکھ لڑکے بھی اسی سکول میں پڑھنے آتے تھے اور مسلمان لڑکوں کے ساتھ اکٹھے ایک ہوسٹل میں رہتے تھے۔

گورنمنٹ ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر سکھ تھا، لیکن اس زمانے کے رواج کے مطابق پڑھائی شروع ہونے سے پہلے پورے سکول کے طالب علموں کا ایک منظم اجتماع ہوتا تھا اور دعائیہ نظمیں گا کر پڑھی جاتی تھیں۔ جن میں علامہ اقبال کی مشہور دُعائیہ نظم:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اکثر پڑھی جاتی۔ میں نے کبھی کوئی ہندووانہ پس منظر کی پرارتھنا ان موقعوں پر نہیں سنی، حالانکہ ماسوا چند مسلمان طالب علموں کے باقی سب ہندو اور کچھ سکھ تھے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے معمولات میں ہندو مسلم کی بنیاد پر تفریق نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ لڑکوں کے ایک مڈل اور ہائی سکول کے علاوہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے لڑکیوں کا گورنمنٹ گرلز اینڈ نارمل سکول تھا، جس میں پندرہ بیس مسلمان لڑکیوں کے سوا باقی سب ہندو یا سکھ لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ میری ہمشیرہ بھی اس سکول میں داخل تھیں۔ سکول کی کمپاؤنڈ کے قریب ہی چھوٹی سی مسجد تھی۔ جب وہاں ظہر کی نماز کی اذان ہوتی تو ہماری ہمشیرہ ہمیں بتاتیں کہ لڑکیاں کھیل رہی ہوتیں تو فوراً رُک جاتیں اور سروں کو اپنے دوپٹوں سے ڈھانپ لیتیں۔ یہ سب ہندو یا سکھ لڑکیاں ایسا کرتیں۔ اس سے اس زمانے یعنی ۱۹۳۵ء-۱۹۳۷ء کے سالوں کے عام ماحول کا اندازہ لگایا

جا سکتا ہے۔

ہم جس محلے میں رہتے تھے وہ تمام تر ہندوؤں پر مشتمل تھا صرف ہمارا گھرانہ مسلمان تھا۔ ہم اپنے ہندو پڑوسیوں اور ہمجولیوں سے آزادانہ ملتے جلتے اور کھیلتے کودتے لیکن یہ میل جول گھروں سے باہر تک محدود تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا نہیں تھا۔

دوکاندار دو چار مسلمانوں کے سوا سبھی ہندو تھے اور جب کبھی ٹھنڈا لینے یا پینے ہندو کی دوکان پر جاتے تو دیکھتے کہ اس نے ایک کونے میں ناصاف دو تین گلاس الگ سے رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی مشروب اس سے مانگتے تو اچھوتوں کی طرح ہم گلاس اُٹھاتے، وہ کم سے کم دو فٹ کی اونچائی سے اس میں پانی ڈالتا تاکہ اسے صاف کرلیں اور پھر اس میں مشروب ڈال دیتا۔ ایک دن مجھے والدہ نے بازار سے دہی لانے کو کہا۔ دودھ دہی کی دوکان بھی ہندو کی تھی، اس نے دُور سے میرے برتن میں دہی انڈیل دی، اچانک مجھے اس رویّے سے دھچکا سا لگا اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ سے میں کبھی ہندو کی بنائی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ اس وقت میری عمر صرف گیارہ سال تھی۔ بظاہر معاشرتی میل جول کے یہ چھوت چھات بہرحال ہندوؤں کے طرزِ عمل سے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے اس صورتِ حال سے سمجھوتہ کرلیا ہے اور وہ اس سلوک کے باوجود معمول کے باہمی روابط میں اسے کوئی رکاوٹ نہیں سمجھتے تھے۔ (افسوس! یہی 'سلوک' مسلمان پس ماندہ اقوام کے ساتھ کرتے تھے جنہیں عام لوگ 'چمار' یا 'خاکروب' کے نام سے پکارتے تھے۔ (ایڈیٹر)

ریلوے سٹیشن پر پلیٹ فارم کے ایک کونے میں ایک کھوکھا ہوتا تھا جس پر ہندو پانی لکھا ہوتا اور دوسرے کونے میں اسی طرح کا کھوکھا جس پر مسلمان پانی لکھا ہوتا۔ مسلمان کھوکھے پر دھول اُڑتی رہتی لیکن ہندو کھوکھا صاف ستھرا جس میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی اور اس میں روح کیوڑہ ملا ہوا مسافروں کو دیا جاتا۔ کوئی فیملی ہوتی تو اسے مٹی کے چھوٹے گھڑے ہی بھر کر دے دیئے جاتے۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرانی ہوگی کہ اس کا خرچہ مسلمانوں کی جیبوں سے نکلتا تھا، اور وہ اس طرح کہ فاضلکا کے قرب و جوار میں اکثر زمیندار مسلمان تھے اور وہ جب اپنی

اجناس بیچنے کے لیے بیل گاڑیوں پر منڈی لاتے تو ان کا واسطہ ہندو مہاجن آڑھتیوں سے ہی پڑتا اور وہ اپنی من مانی آڑھت یعنی کمیشن کے علاوہ از خود سیوا کے نام پر مندروں کی دیکھ بھال تک کی کٹوتیاں کرنے کے بعد مسلمان زمینداروں کو ان کی اجناس کی قیمت ادا کرتے۔ زبانی کلامی چاپلوسی سے مسلمان زمینداروں کو ٹھگتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یہی زمیندار بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے انہی ہندو مہاجنوں کے مقروض رہتے۔

اصل میں مسلمان عام طور پر تجارت اور کاروبار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اسے حقیر سا پیشہ سمجھتے تھے۔ خود میرے والد مجھے اکثر دھمکایا کرتے تھے کہ اگر تم نے فرسٹ ڈویژن نہ لی تو میں تمہیں ہٹی یعنی دوکان پر بٹھا دوں گا۔ گویا وہ میرے لیے کاروبار میں لگ جانے کو سزا کے ہم پلہ خیال کرتے تھے۔ تیس پینتیس ہزار کی آبادی کے شہر میں کوئی درجن بھر مسلمان کاروبار کرتے تھے اور وہ بھی واجبی پیمانے کا، باقی مسلمان اکثر و بیشتر مزدور پیشہ تھے کوئی بڑھئی ہے تو کوئی لوہار، کوئی سقہ ہے تو کوئی دھنیا، کوئی جولاہا ہے تو کوئی دھوبی۔

اگر معاشی لحاظ سے مسلمان زبوں حال تھے تو سیاسی شعور میں بھی پھسڈی تھے، مفلوک الحال لوگ بھلا سیاست میں کیا دلچسپی لینے کے اہل ہو سکتے تھے۔ کانگریس کے زیرِ اثر ہندوؤں میں سیاسی بیداری بدرجۂ اتم موجود تھی، اس کے برعکس پورے شہر میں صرف ایک شخص جس کا نام ملک رب نواز تھا مسلم لیگ سے وابستہ تھا اور اپنی محدود آمدنی سے اس کا پیغام مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کرتا تھا۔ ملک صاحب پیشے کے لحاظ سے ایڈووکیٹ تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے۔

سیاسی شعور کا تعلق بڑی حد تک تعلیم سے بھی ہے، ہندو اس میدان میں مسلمانوں کو بہت پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ تعلیم سے ہندوؤں کی دلچسپی اس سے ظاہر تھی کہ ہمارے ہاں ایک مندر تھا جسے عام طور پر کٹیا کہا جاتا تھا، اس کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی اصل مندر سے پہلے ایک ہال یا ہال نما کمرہ تھا جس میں روزانہ انگریزی اور اُردو کے مختلف اخبار آتے تھے۔ اس

میں داخلے کی کوئی ممانعت نہیں تھی، ہندو، مسلمان، عیسائی جو بھی چاہے اس میں اخبار پڑھنے کے لیے جا سکتا تھا، میں نے وہیں دلی سے چھپنے والا Statesman اور لاہور سے آنے والا ٹریبیون پڑھنا شروع کیا تھا۔ ظاہر ہے، اس ریڈنگ روم کا مندر کی رسومات سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن یہ سہولت ہندوؤں نے ایک طرح سے مفادِ عامہ کے جذبے کے تحت مہیا کر رکھی تھی۔

سیاسی فضا میں گرمی اس وقت پیدا ہونی شروع ہوئی جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں میں انتخابات ہوئے اور صوبائی اسمبلیاں وجود میں آئیں اور وزارتیں بنیں۔ جن صوبوں میں اقتدار کانگریس کے ہاتھ آیا، اس کی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ طرح طرح کی بے انصافیاں روا رکھیں۔ کانگریسی حکومتیں اقتدار کے نشے میں اس قدر بدمست ہو گئیں کہ جب اختیار سے تجاوز کرنے پر اُنہیں صوبوں کے انگریز گورنر ٹوکتے تو وہ جز بز ہو جاتیں۔ بالآخر گورنروں کو دباؤ میں لانے اور انہیں کھلی چھٹی نہ دینے پر احتجاج کے طور پر ساری صوبائی کانگریسی حکومتیں مستعفی ہو گئیں۔ پہلی بار کانگریس کو اقتدار ملا تو انہوں نے اپنے رویوں سے مسلمانوں پر واضح کر دیا کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت اقتدار میں آنے کے بعد کیا گل کھلائے گی۔

ان کے مستعفی ہونے پر قائداعظم نے سیاسی Master Stroke کے طور پر اعلان کیا کہ مسلمان کانگریسی راج سے گلوخلاصی کی خوشی میں Deliverance Day (یومِ نجات) منائیں گے۔ اس پر ہندوؤں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور دھمکیاں دینی شروع کیں کہ اس سے ہنگامے پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن قائداعظم اپنے اعلان پر ڈٹے رہے اور ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو یومِ نجات ہندوستان بھر میں منایا گیا۔ اس میں مسلمانوں نے ایسے نظم وضبط کا مظاہرہ کیا کہ کہیں بھی امن وامان کا ذرا سا بھی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ اس پر Statesman کے اس وقت کے انگریز ایڈیٹر Sir Arthur Moore نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا Days and Weeks اور اس نے یومِ نجات کا کانگریس کے اس قسم کے احتجاجوں سے موازنہ کیا جو ہمیشہ فسادات کا باعث بنتے تھے اور قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں اور مسلمانوں کے نظم وضبط کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

یومِ نجات منانے سے ایک طرف کانگریس نے اپنے چہرے پر منافقت کا جو پردہ ڈال رکھا تھا، وہ چاک ہوگیا اور دوسری طرف خود مسلمانوں پر ہندوؤں کے اصل عزائم واضح ہو گئے۔ حقیقت میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا تعین کرنے میں اسے ایک turning point کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے جب کانگریسی حکومتوں کی مسلمانوں پر زیادتیوں کی رپورٹ مرتب کی اور اس کی اشاعت ہوئی تو سیاسی فضا میں گرمی پیدا ہوگئی۔ اسے پیر پور رپورٹ کا نام دیا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مولوی اے کے فضل الحق نے بھی جو اس وقت بنگال کے وزیرِ اعلیٰ تھے اپنے طور پر ان زیادتیوں پر ایک رپورٹ تیار کی اور وہ Statesman میں قسط وار چھپی۔ اس نے ان کی مسلمانوں میں مقبولیت کو بہت تقویت پہنچائی۔ بعد میں جب ۱۹۴۰ء کا لاہور میں اجلاس ہوا تو اے۔ کے فضل الحق ہی کو وہ قرار داد پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جسے قرار دادِ پاکستان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

اب میں ۱۹۴۰ء کے اجلاس کی کچھ یادداشتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، میں اس وقت گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا اور اس اجلاس میں تینوں دن شریک ہوا۔ جہاں میں رہتا تھا وہ ایک پرائیویٹ ہوسٹل تھا جس میں مختلف کالجوں کے مسلمان طالب علم رہائش پذیر تھے۔ یہ علاقہ موہنی روڈ کے نام سے موسوم تھا۔ اور داتا دربار کی مسجد اور بادشاہی مسجد دونوں سے یکساں فاصلے پر تھا، میں کبھی جمعہ کی نماز داتا دربار میں پڑھنے جاتا اور کبھی بادشاہی مسجد میں۔

بادشاہی مسجد میں جاتا تو دیکھتا کہ نواب سر محمد شاہنواز ممدوٹ، آڑا پاجامہ اور اچکن پہنے، سر پر ردی ٹوپی رکھے، ہاتھ میں لمبا فیتا لیے، توند خاصی ابھری ہوئی اور کوئی ساٹھ کے پیٹے میں، منٹو پارک میں اس تاریخی اجلاس کے انعقاد کے لیے سٹیڈیم طرز کی تعمیر کی اکثر نگرانی کرتے دکھائی دیتے۔ اجلاس شروع ہوا تو سب سے کم درجے کا Season ٹکٹ یعنی تینوں دن کے اجلاس کے لیے پانچ روپے کا ملتا تھا جو میں نے خریدا۔ ڈائس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا ٹکٹ ۲۰۰ روپے کا تھا۔ اس موقع پر حیدرآباد دکن کی ایک بٹن فیکٹری کے بنے ہوئے پن سے لگانے والے بیج (Badge) بھی فروخت ہوئے۔ ایک بیج انڈہ نما تھا جس پر قائداعظم کی تصویر

تھی اور دوسرا مسلم لیگ کے جھنڈے کا نمونہ، قیمت ہر ایک کی دو آنہ تھی، اس وقت ایک روپیہ سولہ آنے کا اور ایک آنہ چار پیسے کا ہوتا تھا۔

اجلاس تو ۲۲/ مارچ کو شروع ہوا لیکن ۲۱ کی شام جب قائداعظم جلسہ گاہ میں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کرنے آئے تو میں بھی ان چند لوگوں میں سے تھا جو اس وقت موجود تھے۔ اس اجلاس سے تین دن پہلے یعنی ۱۹/ مارچ کو جلسہ گاہ کے قریب ہیرا منڈی کے علاقے میں خاکساروں کے بیلچوں سے مسلح ایک جتھے نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا اور پولیس سے اُن کا تصادم ہوگیا جس میں گولی چلی اور ۲۴ خاکسار مارے گئے۔ اس نے فضا کو انتہائی سوگوار بنا دیا اور خود اجلاس کا انعقاد غیر یقینی دکھائی دینے لگا لیکن قائداعظم کے عزم اور مسلمانوں کے جوش و جذبہ نے اسے مقررہ تاریخوں پر ممکن بنا دیا۔

خاکساروں پر گولی چلنے کے دوسرے دن جب میں کالج گیا تو تاریخ کے ہندو پروفیسر مسٹر چوپڑا (Chopra) نے لیکچر کی ابتدا اس واقعے سے کی اور کہنے لگا:

"I hope there are no sympathizers of Khaksars in this class who would chop off my head."

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اونچی آواز میں جواباً کہا:

"Yes Sir, there are."

اس پر وہ ٹھٹکا اور پھر موضوع بدل دیا بلکہ لیکچر ہی ادھورا چھوڑ دیا۔ ۲۲/ مارچ کو اجلاس شروع ہوا تو سر سکندر حیات خان جو اس وقت پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ اور مسلم لیگ کے ممبر تھے، ڈائس کے پیچھے سے چوری چھپے اندر آئے مبادا کوئی بپھرا ہوا مسلمان ان پر دست درازی نہ کر بیٹھے۔

اس کے برعکس مولوی فضل الحق جو کانگریسی حکومتوں کی مسلمانوں پر زیادتیوں کی رپورٹ اور دھڑلے کے بیانات سے خاصی مقبولیت حاصل کر چکے تھے، مین گیٹ سے پنڈال میں داخل ہوئے تو گویا پورا پنڈال اُٹھ کھڑا ہوا اور شیرِ بنگال کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ ان کی چال ایسی تھی جیسے کوئی جھوم رہا ہو، سر پر رومی ٹوپی، بدن پر اچکن، کھلے پائنچوں والا پاجامہ، ایک پائنچہ ذرا اُٹھا ہوا اور پاؤں میں دو رنگے فلیٹ بوٹ، ایک جوتے کے تسمے کھلے ہوئے۔ یہی

ان کا معمول کا رنگ ڈھنگ تھا۔ قائداعظم ڈائس پر بیٹھ چکے تھے، خراماں خراماں فضل الحق ڈائس کی طرف بڑھ رہے تھے اور حاضرین کے جس ٹکڑے کے قریب سے گزرتے وہاں لوگ جوش و خروش سے بے قابو ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے استقبال میں نعرے لگانے شروع کر دیتے۔ اس دن اجلاس ختم ہوا تو سکندر حیات تو جس طرح اندر آئے تھے اسی طرح پیچھے سے کھسک گئے۔ لیکن خضر حیات ٹوانہ جو اُن کی کابینہ کا وزیر تھا، سفید اونچا طرہ سجائے اور برجس پہنے سامنے کے گیٹ سے جانے لگا تو لوگوں نے اس پر لعنتوں کی بوچھاڑ کر دی، یہی شخص بعد میں پاکستان کے قیام سے قبل کے زمانے میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ رہا اور اسی کے دور میں صوبے کے مسلمانوں نے اس کے خلاف تاریخی تحریک چلائی۔ ۲۲ر مارچ کی قائداعظم کی تقریر میری یادداشت کے مطابق دو گھنٹے ۴۰ منٹ جاری رہی۔ پوری تقریر فی البدیہہ تھی۔ عام طور پر جو تھوڑی بہت اَور موقعوں کے خطابات کی اُن کی آواز میں ریکارڈنگ موجود ہے، اُس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنے شگفتہ مزاج تھے۔ وہ ایک پروقار انداز اور ٹھہراؤ سے بولتے، ہر لفظ واضح ہوتا، مناسب emphasis دیتے اور کبھی کبھی کسی بات کو نمایاں کرنا ہوتا تو ذرا سی دیر کے لیے یعنی دو چار سیکنڈوں کے لیے رُک جاتے اور پھر اپنی آواز میں گہرائی پیدا کر کے بات کہتے۔ جب رُکتے تو سننے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے کہ اب کوئی اہم بات کرنے والے ہیں۔ یوں ان کے تجسس کو اُبھارتے اور ان کی توجہ بڑھاتے تاکہ وہ انہیں غور سے سنیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی آواز کے زیر و بم سے خاص کر گاندھی جی کے بیانات کے تضحیکی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے یا اُن کی چاپلوسیوں کے بخیے اُدھیڑتے۔ ایسے موقعوں پر سننے والے ان کے مزاح سے خوب محظوظ ہوتے۔

۲۲ر مارچ کی تقریر سے ہی ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ قائد، گاندھی جی کے اخبار ہریجن سے جو وہ ہفتہ وار شائع کرتے تھے، حوالہ دیتے اور پھر اس پر ساتھ ساتھ تبصرہ کرتے جاتے۔

"Gandhi: To me Hindus, Muslims, Parsis, Harijans, are alike. I cannot be frivolous.

Quaid: But I think he is frivolous.

Gandhi: I cannot be frivolous when I talk of Quaid-i-Azam Jinnah. He is my brother.

Quaid: The only difference is that brother Ghandhi has three votes and I have only one vote. (laughter)

Gandhi: I would be happy indeed if he could keep me in his pocket.

Quaid: I do not know really what to say to this latest offer of his."

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ قائداعظم کس طرح مخالف آراء سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے تھے۔ گاندھی جی کی جس تحریر کا قائداعظم نے حوالہ دیا وہ صرف دو دن پہلے یعنی ۲۰ر مارچ کے ہریجن میں چھپی تھی۔

اجلاس کے اختتام پر میں کالج گیا تو انگریزی کی کلاس کمرے میں بیٹھ چکی تھی لیکن پروفیسر اندر موہن ورما نے ابھی اپنا لیکچر شروع نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کے کالر پر دونوں بیج لگا رکھے تھے۔ ایک پر قائداعظم کی تصویر تھی اور دوسرے پر مسلم لیگ کا جھنڈا۔ کلاس روم میں داخل ہوا تو اپنی سیٹ پر جانے سے پہلے ہی پروفیسر ورما نے مجھے راستے میں روک لیا اور قریب سے بلکہ ہاتھ سے چھو کر دونوں (Badges) دیکھے۔ جب میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تو پروفیسر ورما نے قائداعظم کی ایسے اہم موضوع پر اتنی لمبی فی البدیہہ تقریر پر اُن کو کھلے دل سے خراجِ تحسین پیش کیا۔

سارے کالج میں، میں واحد طالب علم تھا جو یہ بیج لگا کر گیا تھا، اس وجہ سے میں اپنے دوستوں میں صرف مسلم لیگی نام سے مشہور ہو گیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی جب بھی ان میں سے کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو مجھے اوئے مسلم لیگی کہہ کر پکارتے۔ ان میں ریٹائرڈ چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کے بڑے بھائی ایم۔ ایچ شاہ جو راولپنڈی کے کمشنر بھی رہ چکے ہیں اور مرحوم سردار عاشق حسین مزاری، شیریں مزاری کے والد شامل ہیں۔

بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ۱۹۴۰ء کے اجلاس کے حوالے سے دو ایک اور یادداشتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میں خاص طور پر نواب بہادر یار جنگ کا ذکر کروں گا۔ نواب

صاحب آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر اور خاکسار تحریک کے نائب سالارِ اعلیٰ یعنی علامہ مشرقی کے بعد دوسرے نمبر پر تھے۔ میں نے اس وقت کے مشہور و معروف مقرروں مولانا ابوالکلام آزاد، سیّد عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کو بھی سُن رکھا تھا لیکن سچ کہتا ہوں نواب صاحب کی فصاحت و بلاغت اور اُردو پر اُن کی دسترس کسی اور کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ موچی دروازے کے باہر جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے خود ہی کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو چند منٹوں میں آپ کو رُلا سکتا ہوں اور چاہوں تو چند منٹوں میں آپ کو ہنسا سکتا ہوں لیکن آج میں آپ سے مسلمانوں کو درپیش اہم مسائل پر سنجیدہ بات کرنا چاہتا ہوں۔

۲۴ر مارچ کو اختتامی اجلاس میں جو عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوا، قائداعظم اُٹھے اور نواب صاحب کو تقریر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

Now I call upon Nawab Bahadur Yar Jung to speak on any subject he likes.

اس پر نواب صاحب اُٹھے اور تقریر کرتے ہوئے کہا، آج میرے ممتحن قائداعظم ہیں اور پرچہ اتنا مشکل، میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا اس کے بعد قائداعظم پر چھوڑتا ہوں وہ مجھے پاس کرتے ہیں یا فیل۔ ان کی تقریر کوئی پچاس منٹ جاری رہی اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا ہزاروں کے اجتماع میں ایک بھی شخص موجود نہیں۔ انہوں نے تقریر ختم کی تو اجلاس بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔

نواب صاحب کی سحر بیانی کا سامعین پر کیا اثر ہوتا تھا، غالباً ۲۴ر مارچ کی سہ پہر کو ہی اُنہوں نے سٹیٹس مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک سیشن منعقد کیا جس میں مولانا ظفر علی خان بھی موجود تھے، اُنہوں نے اور باتوں کے علاوہ اپنی تقریر میں شکایت کی کہ مہاسبھائیوں نے ریاست حیدرآباد کے خلاف ایجی ٹیشن کیا تو کوئی مسلمان کسی علاقے سے ریاست کی حمایت میں نہیں پہنچا۔

اس وقت مولانا ظفر علی خان اُٹھے اور اُنھوں نے کہا ایسی بات نہیں میں نے جو نیلی پوش جماعت ترتیب دی تھی، اس کے رضاکار ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کا توڑ کرنے کے لیے

حیدرآباد گئے تھے۔ لیکن حاضرین پر نواب صاحب کی باتوں کا اتنا اثر تھا کہ مولانا ظفر علی خان جیسے قادر الکلام مقرر کو اُنھوں نے hooting سے بٹھا دیا۔

اِسی تاریخی اجلاس کے دوران یومِ اقبال بھی منایا گیا جس کی ایک نشست کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے پرانے کیمپس کے ہال میں قائداعظم نے کی۔ یہاں بھی نواب صاحب کوئی آٹھ دس منٹ بولے ہوں گے کہ اُنھوں نے سامعین کو سحر زدہ کر دیا۔ آج بھی ان کے دو ایک فقرے مجھے کچھ کچھ یاد ہیں، اقبال کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> اے سرزمینِ لاہور تمھیں اس بات پر اِترانا چاہیے کہ تمھیں اس مردِ مومن کے قدموں نے روندا ہوا ہے۔ اے فضائے لاہور تمھیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ تمھیں اس حکیم الامت کے سانسوں نے گرمایا ہوا ہے، اے اہلِ لاہور تمھیں اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہیے کہ وہ دانائے راز تمھارے درمیان آسودۂ خاک ہے۔

جلسہ ختم ہونے پر قائداعظم جب ڈائس سے نیچے اُترنے لگے تو ٹریبون (Tribune) اخبار کے فوٹوگرافر نے جو انہی کی طرح لمبے قد اور اکہرے جسم کا تھا اُن سے ایک لمحے کو رُک جانے کو کہا تاکہ وہ اُن کی فوٹو بنا سکے، وہ اپنے Tripod کو جس پر اس زمانے میں کیمرا رکھ کر فوٹو اُتاری جاتی تھی، ذرا ٹھیک سے رکھنے لگا تو قائد نے جو ڈائس کی دو سیڑھیوں میں سے ایک سیڑھی نیچے آ چکے تھے، اپنے دائیں ہاتھ سے ہلکی سی چٹکی بجاتے ہوئے اُسے کہا: Hurry up۔ اس سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ قائد اپنی ذاتی تشہیر سے کس قدر بے پرواہ تھے۔

ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۱ء میں قائداعظم پھر پنجاب تشریف لائے اور پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے دو روزہ اجلاس کی صدارت کی جو یکم اور ۲/ مارچ ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے کھیل کے میدان میں منعقد ہوا۔ ۲۸/ فروری کی شام جلسہ گاہ میں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی تقریب کے لیے تشریف لائے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی پندرہ بیس لوگ اس وقت

موجود تھے جس میں مَیں بھی تھا۔ مسٹر عبدالحمید ایم۔اے نے جو جزوقتی آسٹریلشیا مسجد ریلوے سٹیشن کے قریب امامت کے فرائض انجام دیتے تھے، استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے قائداعظم کو جھنڈا لہرانے کی دعوت دی، قائداعظم نے جب جھنڈے کی رسی پکڑ کر کھینچنی شروع کی تو جھنڈا کھل نہ سکا۔ اس پر عبدالحمید نے معذرت کی اور اُمید ظاہر کی کہ اس لغزش کو قائداعظم طلباء کے جوش و جذبہ کا پاس کرتے ہوئے نظرانداز کر دیں گے، لیکن قائداعظم نے بغیر لگی لپٹی کے کہا:

It is all very well to talk of the enthusiasm of the youth but discipline is discipline.

یکم مارچ کو جلسہ شروع ہوا تو اُٹھتے ہی فرمایا:

Today is the first of March. Let us march on. It is a convention that the presidential address is delivered at the inaugural session, but I am not going to follow it, because this time I have come to listen what the youth have to say. I will speak at the closing sitting tomorrow evening.

یہ کہہ کر قائداعظم بیٹھ گئے اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے طالب علم مقررین نے جذباتی تقریریں کیں اور قائداعظم کے اشارے پر اپنا خون تک بہانے کے اعلان کیے۔ دو دن یہی سلسلہ جاری رہا۔ قائداعظم کی تقریر سننے کے لیے اجلاس میں خال خال سکھ نوجوان بھی نظر آئے۔ سکھ تو پہچانے جا سکتے ہیں، شاید کچھ ہندو بھی آئے ہوں۔

۲/ مارچ کو عشا کے بعد اختتامی اجلاس شروع ہوا تو قائداعظم اُٹھے اور ایک آدھ لفظ کے سوا مجھے یقین ہے، ان کے فرمودات حرف بحرف آج بھی یاد ہیں، اُنہوں نے کہا:

Youth is after all youth. I know the Musalmans are always ready to shed their blood. But I am a different type of leader. I do not want your blood. I want you to give me something which it is very difficult for the Musalmans to give. You give me that and I will get you Pakistan.

قائداعظم ہمیشہ 'مسلم' کی بجائے 'مسلمان' کا لفظ استعمال کرتے تھے، اس کے بعد قائد نے جو اُن کا ایک خاص انداز تھا، بات کو اُجاگر کرنے کے لیے چند سیکنڈوں کا وقفہ دیا اور

پھر گرج دار آواز میں کہا:

Give me discipline and I will get you Pakistan.

اس کے بعد اپنے پورے مزاج سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہا:

I am a logically constituted man. Emotions do not sway me. When a problem comes up before me I look at all its pros and cons. Once I come to a decision, I stick to it.

اسی دورے کے دوران یا شاید اس کے بعد قائداعظم ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنے کے لیے تشریف لائے جو موچی دروازے کے باہر ہو رہا تھا۔ اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں ان کو سننے کے لیے آئے تھے، جلسہ رات کے وقت تھا، شاید تعداد کی کثرت کی وجہ سے یا انتظامی بے توجہی کے باعث لوگوں کی خاصی دھکم پیل ہوئی اور قائداعظم مشکل سے ڈائس تک پہنچ پائے۔ اُنہوں نے اپنی تقریر اُردو میں شروع کرنے کی کوشش کی، اس وقت تک وہ ایک فقرہ بھی اُردو میں ٹھیک سے مکمل نہیں کر سکتے تھے۔ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں English please! English please! اس پر قائداعظم نے جب انگریزی میں کہا: Ladics and gentlemen! تو پورے مجمع میں تالیاں گونج اُٹھیں۔ لیکن مجھے یاد ہے قائداعظم نے کوئی تقریر کرنے کی بجائے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جلسے میں indiscipline کی مذمت کی اور صرف چند جملوں کے بعد چلے گئے۔ اگر کوئی ایک خوبی اُن کی شخصیت کی پہچان کہی جا سکتی ہے تو وہ نظم وضبط کی پابندی تھی، وہ جذبات میں بہہ جانے کو کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

کالج میں ایم۔اے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نومبر ۱۹۴۴ء میں دلی میں آل انڈیا ریڈیو کی سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کے ہندوستانی نیوز یونٹ میں بطور مترجم ملازم ہو گیا، یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم اپنے آخری مراحل میں پہنچ چکی تھی، انگریزی اقتدار ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے تعین کے سلسلے میں انگریز حکومت اور ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان سنجیدہ سیاسی مذاکرات کا آغاز ہو چکا تھا، بالآخر تین جون ۱۹۴۷ء کا وہ عہد ساز دن آن پہنچا جب Partition Plan کا اعلان ہوا۔

ہندوستانی یونٹ کے سب سے سینئر مترجم شریف حسین آرزو تھے، وہ اپنے فن کے استاد مانے جاتے تھے اور جنگ کے متعلق کئی ایک اصطلاحوں اور لفظوں کے ترجمہ کرنے کے لیے مشہور ہو چکے تھے، مثال کے طور پر اُنہوں نے submarine کا ترجمہ ڈُبکی اور minsweeper کا ترجمہ سرنگ سمیٹ جہاز کیا، anti-aircraft gun کا ترجمہ ہوا مار توپ کیا تو پروفیسر اے ایس بخاری (پطرس) نے جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے، اسے متبذل قرار دیا تو وہ متروک ہو گیا۔ ان سے ہٹ کر آرزو صاحب نے meningitis کا ترجمہ گردن توڑ بخار کیا۔ مجھ سے کہنے لگے جب یہ لفظ ترجمہ کے لیے میرے سامنے آیا تو مَیں نے ڈاکٹر سے پوچھا اس بیماری کی نمایاں علامت کیا ہے تو اس نے بتایا، اس کی شدت سے مریض کی گردن لٹک سی جاتی ہے، اس پر مَیں نے ترجمہ گردن توڑ بخار کر دیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد جب میں ریڈیو پاکستان کے ایڈیٹوریل سٹاف کی صفوں میں داخل ہو چکا تھا، مجھے یونہی محسوس ہوا کہ ہم اُردو میں Chief Minister اور Prime Minister دونوں الفاظ کا ترجمہ جو وزیراعظم کر رہے ہیں وہ ذرا کھَلتا ہے۔ میں نے پرانے مترجم ساتھی فخر الاسلام کو جو اس وقت اُردو نیوز یونٹ میں موجود تھے، بلایا اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر چیف منسٹر کا ترجمہ وزیراعلیٰ کیا جائے تو کیسا رہے گا۔ کہنے لگے میں آج کے بلیٹن ہی میں اسے استعمال کرتا ہوں، چند روز کے استعمال سے وہ اخباروں میں بھی لکھا جانے لگا۔

ایم۔ایل۔ چاولہ نے جو اس وقت سینئر ڈپٹی ڈائریکٹر آف نیوز تھے، آرزو صاحب سے کہا کہ قائداعظم کی تقریر کے علاوہ نہرو کی تقریر کا ترجمہ بھی آپ کریں گے، لیکن اس کی زبان میں ہندی کی طرف جھکاؤ ہو اور لکھی جائے دیوناگری رسم الخط میں۔ آرزو صاحب نے قائد کی تقریر کا ترجمہ تو سلیس اُردو میں کیا اور چاولہ صاحب کی ہدایت کے مطابق پنڈت نہرو کا ہندی مائل ہندوستانی میں۔

جب نہرو اس ترجمے کو دیکھنے لگے تو وہ بعض ہندی الفاظ اور تراکیب سے بوکھلائے

اور اُنھوں نے اس مترجم کو بلانے کو کہا جس نے ترجمہ کیا تھا۔ آرزو صاحب ننگے پاؤں سٹوڈیو میں اُن کے پاس گئے تو اُنہوں نے کہا کہ بھئی آپ ''کچھ'' کی جگہ ''چند'' کا لفظ اور ''رکھ رکھاؤ'' کی جگہ ''رواداری'' کا لفظ کیوں نہیں لکھ سکتے۔ پھر ایک ہندی کے لفظ کا مطلب پوچھا تو آرزو صاحب نے کہا اُردو میں اس کا بدل ''غفلت'' ہے تو نہرو نے کہا تو بھئی اسے لکھو نا، پھر کہنے لگے ''زبان سلیس اور فقرے چست ہونے چاہئیں۔'' لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا، بعد میں آرزو صاحب نے ہمیں بتایا کہ میں نہرو صاحب سے کیسے کہتا کہ ہندی میں فقرے 'کیونکر' چست ہو سکتے ہیں۔ چاولہ صاحب کی ہندوئیت نے نہرو صاحب کے لیے مشکل پیدا کر دی کیونکہ ان کے ثقافتی ماحول پر مسلم ثقافت کا اثر تھا اور وہ صاف اُردو بولتے تھے، ویسے بھی نہرو رواں نہیں بول سکتے تھے، اٹک اٹک کر بولتے تھے، اُس دن تو ہندی نما ہندوستانی اور پھر دیوناگری رسم الخط نے اُن کی ادائیگی میں اور بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور ہمارے ہندو ساتھی اُن کی ادائیگی سے بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے یہ لہجہ تو شکست خوردہ شخص کا ہے۔

اس کے برعکس قائداعظم نے انگریزی کی تقریر پروقار اور واضح انداز میں دوسرے لیڈروں کی طرح خود ہی نشر کی لیکن اُردو ترجمہ انصار ناصری نے جو اس وقت دلی ریڈیو سٹیشن سے وابستہ تھے، پڑھا۔ بات یوں ہوئی کہ سردار پٹیل جو اس وقت نہرو کی کابینہ میں اطلاعات و نشریات کا شعبہ سنبھالے ہوتے تھے، شکیل احمد کی آواز اور ادائیگی خاص کر ہندی الفاظ سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے بطورِ خاص یہ ہدایت دی کہ ۳/ جون کا رات کا بلیٹن شکیل پڑھیں۔ حالانکہ ہماری ٹیم میں راج ہنس تو کلی مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر اچھے انداز سے ہندوستانی خبریں بھی پڑھا کرتے تھے۔ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے ہمارے یونٹ میں پی این گورکھا بھی جو ایک زمانے میں لاہور سے چھپنے والے مشہور اخبار ملاپ کے کالم نویس رہ چکے تھے، موجود تھے لیکن نہرو کی تقریر کے ترجمے کے لیے نظرِ انتخاب آرزو صاحب پر پڑھی۔

قائداعظم صاحب جب تقریر کرنے کے لیے آئے تو سٹوڈیو میں ان کے ساتھ اعجاز احمد پہنچ گئے اور تقریر کے دوران وہیں کھڑے رہے۔ اعجاز احمد کالج میں میرے ہم جماعت اور

بھٹو کے دور کے وزیر خارجہ جناب عزیز احمد کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اُنہوں نے ڈان اور نیشن میں مختلف اوقات میں اپنے تاثرات اور مشاہدات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں وہ انگریزی کی خبریں پڑھا کرتے تھے، اُنہوں نے بیان کیا ہے کہ جب قائداعظم اپنی تقریر ختم کر چکے تو اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور غیر ارادی طور پر اُنہوں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ گویا ایک لمحے کے لیے وہ یہ بھول گئے کہ وہ سٹوڈیو میں اکیلے بیٹھے ہیں، کسی مجمع یا جلسہ میں تقریر نہیں کر رہے۔ اعجاز احمد کہتے ہیں میں نے بھی قائد کے ساتھ ہوا میں اپنا ہاتھ بلند کیا، لیکن اپنی آواز بلند نہ کی کہ کہیں وہ بھی نشر نہ ہو جائے۔

انصار ناصری نے صرف اُردو ترجمہ پڑھا لیکن بعد میں اُنہوں نے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ ترجمہ بھی میں نے کیا تھا۔ یہ دعویٰ اُنہوں نے ۴؍جون ۱۹۶۹ء کو شامِ ہمدرد میں ۳؍جون کی تقریب کے سلسلے میں راولپنڈی میں کیا جب اس دعویٰ کی خبر اخباروں میں چھپی تو میں نے اُس کی تردید کی۔ آرزو صاحب بھی حیات تھے، اُنہوں نے بھی اُن کے دعویٰ کو جھٹلایا۔ اُنہوں نے لوگوں کی بے علمی سے فائدہ اُٹھایا۔ ۳؍جون کی تمام تقریریں اور ان کے ترجمے سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کے ذمے اور سپرد تھے۔ دلی ریڈیو سٹیشن یا اس میں کام کرنے والے کسی کارکن کا اس سلسلے میں نہ کوئی تعلق بنتا تھا اور نہ ذمہ داری۔ انصار ناصری صاحب کو قائد کی تقریر کا اُردو ترجمہ پڑھنے کے لیے اس لیے طلب کیا گیا کہ پٹیل کی ہدایت کے مطابق شکیل بلیٹن کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے راج ہنس کو قائد کی اُردو تقریر پڑھنے کو نہیں کہا جا سکتا تھا۔

آج بھی ریڈیو پاکستان کے خبروں اور پروگرام کے شعبے الگ الگ ہیں، ان کی ذمہ داریاں اور دائرۂ کار بھی الگ الگ ہیں، لہٰذا انصار ناصری صاحب کے دعویٰ کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں مشہور ادیب اور کالم نویس انتظار حسین نے روزنامہ مشرق لاہور میں جو، اب مرحوم ہو چکا ہے، ''مدعی دعویٰ کرتے ہی پکڑا گیا'' کے عنوان سے بڑا خوبصورت اور دلچسپ کالم ۴؍جون ۱۹۶۹ء کو لکھا جس میں اُنہوں نے خود آرزو صاحب کے بیان کا بھی حوالہ دیا جو اس وقت ریڈیو پاکستان میں سینئر نیوز ایڈیٹر تھے اور اُنہوں نے تصدیق کی تھی کہ نہرو اور قائد دونوں

کی تقریروں کے ترجمے اُنہوں نے ہی کیے تھے۔ انصار ناصری کے دعویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے انتظار حسین نے لکھا ''ایسا قدم بڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر اس سے پہلے تھوڑے حفاظتی اقدامات ضروری ہوتے ہیں، مثلاً پہلے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ اس واقعہ کا کوئی عینی گواہ تھا تو وہ اس دُنیا سے اُٹھ چکا ہے۔ یہاں ایک چھوڑ ''دو گواہ زندہ بیٹھے ہیں''۔

۳ر جون کے اعلان کے بعد اگرچہ آل انڈیا ریڈیو کے مسلمان، ہندو اور سکھ کارندوں کے درمیان کوئی مخاصمتی کھچاؤ پیدا نہیں ہوا لیکن اپنے اپنے سیاسی دھڑے سے وابستگیاں نمایاں ہوگئیں۔ ہندوستانی نیوز یونٹ میں برکات احمد کے سوا جو احمدی تھے باقی سب مسلمان ارکان بعد میں پاکستان آ گئے۔ ان میں میرے علاوہ شریف حسین آرزو، فخر الاسلام اور شیر محمد قیصر جو اپنے قلمی نام ابنِ انشاء سے زیادہ مشہور ہیں، شامل تھے۔ ان سب میں میری وابستگی مسلم لیگ اور پاکستان سے کچھ زیادہ ہی aggressive تھی۔ پٹیل کی ہندی نوازی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے جب بھی قوم پرست مسلمانوں کا کوئی بیان آتا تو میں اُسے ایسی ہندی نما ہندوستانی میں ترجمہ کرتا کہ مسلمان سننے والوں کے کوئی خاص پلے نہ پڑتا، ہندو ساتھی جز بز ہوتے لیکن جو خبر ترجمے کے لیے جس کے ہاتھ آ جاتی دوسرا اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ خان عبدالغفار خان کے بیانات کو بطورِ خاص ہندی ہندوستانی میں ڈھالا جاتا تاکہ پختون عوام تک ان کی رائے نہ پہنچ پائے اور یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ خان عبدالغفار خان پر ہندو کا جادو اتنا چڑھ گیا ہے کہ اپنی زبان بھول گیا ہے اور ہندی بولنی شروع کر دی ہے۔

پشتو نیوز یونٹ ہم سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ مہر چند کھنہ نے جو سرحد حکومت میں ڈاکٹر خان صاحب کا وزیر خزانہ تھا، خاص انتظام کر رکھا تھا کہ پشتو بلیٹن میں زیادہ سے زیادہ سرخ پوش نقطۂ نظر کی تشہیر ہو۔ لیکن یونٹ کے ارکان خاص کر مرحوم عبدالودود خاں نے اس کی ساری منصوبہ بندی کو یوں خاک میں ملایا کہ پشتو بلیٹن کے لیے بطورِ خاص جو خبریں ترجمے کے لیے دی جاتیں وہ اس کا ترجمہ تو کرتے لیکن محض ریکارڈ میں نشر شدہ مواد کے ساتھ لگانے کے لیے ورنہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر اور پاکستان کے حق میں آنے والی خبروں کو جنرل نیوز روم کے

مین بلیٹن سے اُٹھاتے اور انہیں نشر کر دیتے۔ مہر چند کھنہ سر پیٹتے، شکائتیں کرتے لیکن جب انکوائری ہوتی تو بلیٹن کے ریکارڈ میں وہی خبریں ملتیں جو ان کے حق میں ہوتیں۔ لہٰذا اس طرح مہر چند کھنہ پشتو خبروں پر اپنا اعتراض کھو بیٹھتے اور پاکستان نواز خبریں برابر پشتو میں نشر ہوتی رہتیں۔ ایک جذبہ تھا جو ہر مسلمان کے دل میں اپنی مملکت کے لیے موجزن تھا اور وہ بغیر کسی کے بتائے اس کے حق میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا تھا۔ بات ہوتی تھی تو صرف مسلمان اور ہندو کی، کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ تم پنجابی ہو، سندھی ہو، پختون ہو، بنگالی ہو، سنی ہو یا شیعہ۔ اور پھر امیر غریب، چھوٹے بڑے کی بھی تمیز نہیں رہی تھی، ایک منزل تھی، ایک رُخ تھا اور ایک ہی آرزو۔

۳ر جون کے منصوبے کا اعلان ہوتے ہی، جس سے پاکستان کے قیام کی منزل قریب آ پہنچی، سب سے پہلی مخالف آواز افغانستان سے اُٹھی، افغان حکومت نے اعلان کیا کہ ڈیورنڈ لائن جو ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا تعین کرتی ہے، کی کوئی قانونی حیثیت نہیں اور سرحد پار کے پختون علاقے افغانستان کا ہی حصہ ہیں۔

جس دن یہ خبر چھپی، غالباً ۵ر جون کی تاریخ تھی، اُسی روز شام میں آل انڈیا ریڈیو سے مشہور بنگالی مصنف این۔سی۔ چودھری کا لکھا ہوا تبصرہ نشر ہوا جس میں اُنہوں نے افغانستان کے موقف کے بودے پن کو تاریخی حقائق و دلائل سے آشکارا کیا۔ یہ ایک سکالر کا فوری ردِعمل تھا، کسی سوچی سمجھی پالیسی ہدایت کا نتیجہ نہیں تھا۔

این۔سی چودھری اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو میں ٹاکس افیسر (Talks Officer) تھے، رات نو بجے روزانہ ہندوستانی خبرنامہ نشر ہوتا، جس میں پندرہ منٹ خبریں اور پانچ منٹ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ شامل ہوتا۔ تبصرہ انگریزی میں لکھا جاتا تھا اور اکثر چودھری صاحب ہی لکھتے تھے، پھر ہندوستانی میں ترجمہ ہو کر نشر ہوتا تھا۔

اُنہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ایک کتاب The Continent of Circe کافی مشہور ہوئی۔ اس میں اُنہوں نے گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفہ کو ہندو وئیت کی ضد قرار دیا

اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور تاریخ کے حوالے دیکر ثابت کیا کہ ہندو کے منہ کو خون لگا ہے، اس کی سرشت اور ہندوویت کی پوری تاریخ خون آشام ہے۔ وہ ہندو تہذیب کو بھی فرسودہ کہتے تھے۔ اپنی صاف گوئی کے سبب آل انڈیا ریڈیو میں اُن کے ہندو ساتھی اُن کے سخت مخالف تھے، قد کاٹھ کے لحاظ سے منحنی لیکن علم کے لحاظ سے چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے۔

۱۹۷۱ء میں جب بھارت مشرقی پاکستان پر چڑھ دوڑا تو اُنہوں نے ایک مضمون میں جو غالباً لندن ٹائمز میں چھپا تھا، اُسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ ہندو بنگالیوں کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کے خطے میں بسنے والے مسلم بنگالیوں کو بنگالی کیریکٹر کا صحیح مظہر سمجھتے تھے۔ بالآخر وہ بھارت کے ماحول سے دل برداشتہ ہو کر لندن نقل مکانی کر گئے اور وہیں سورگباش ہوئے۔ تحریکِ پاکستان نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لیا، بلکہ کئی اہلِ نظر دور دیسوں سے بھی اس کے انوکھے پن یعنی بیسوی صدی میں ایک خطے کے مسلمان محض اسلام کے نام پر اپنی آزاد مملکت کے خواہاں تھے، سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ علامہ محمد اسد جو آسٹریا کے رہنے والے ایک Rabbi کے بیٹے تھے، یہودیت کے زمانے میں ان کا نام Leopold Weiss تھا، اُن کی آخری کتاب قرآنِ کریم کا انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر ہے، ان کی پہلی کتاب (بلکہ کتابچہ) Islam at the Crossroads ہے جو ۱۹۳۴ء میں چھپی تھی، آج بھی مسلمانوں کے حالات پر صادق آتی ہے۔ وہ تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان اس غرض سے چلے آئے کہ میں بھی اپنی قلمی کاوش سے اس کے فلسفۂ تشکیل میں اپنا حصہ ڈالوں، ڈلہوزی میں ٹھہرے اور عرفات کے نام سے انگریزی میں ایک ماہنامہ شروع کیا۔ میں اس کے اوّلین خریداروں میں سے تھا اور آج بھی میرے پاس وہ آٹھ شمارے موجود ہیں جو اُنہوں نے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے شائع کیے تھے۔ میں ان کے ایک اہم مضمون What do we mean by Pakistan? جو مئی ۱۹۴۷ء کے شمارے میں چھپا تھا، صرف ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

"I do believe (and have believed it for about fourteen years) that there is no future for Islam in India unless Pakistan

becomes a reality; and that, if it becomes a reality here, it might bring about a spiritual revolution in the whole Muslim world by proving that it is possible to establish an ideological, Islamic polity in our times no less than thirteen hundred years ago. But ask yourselves: Are all leaders of the Pakistan movement, and the intelligentsia which forms its spearhead, quite serious in their avowals that Islam, and nothing but Islam, provides the ultimate inspiration of their struggle? Are they really aware of what it implies when they say, "The object of Pakistan is La ilaha ill Allah"? Do we all mean the same when we talk and dream of Pakistan?

وہ کیسا خواب تھا اور ہم نے اُسے آج کس حقیقت میں بدل دیا ہے۔ آپ نے یہ نوٹ کیا کہ علامہ اسد We all کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پاکستانی بن چکے تھے۔ پاکستان بنا تو پاکستان کی شہریت اختیار کر لی اور پاکستان کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ مرتے دم تک پاکستان کی شہریت ہی برقرار رکھی۔ خود ہی ایک مرتبہ بتایا کہ شاہ فیصل نے جو اُن کے گہرے دوست تھے ایک بار اُن کو سعودی عرب کا شہری بن جانے کو کہا تو میں نے جواب دیا میں پاکستانی ہوں اور پاکستانی ہی رہوں گا، ایسی مملکت کا شہری جو اسلام کے نام پر بنی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ افتخار حسین ممدوٹ نے صوبے میں Department of Islamic Reconstruction کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا اور اسد صاحب کو اس کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ اس حیثیت سے اُنہوں نے عرفات کا نواں اور آخری شمارہ شائع کیا جو بھی میرے پاس ہے۔

پھر وہ وقت آن پہنچا جب حکومت کے ملازمین سے یہ پوچھا جانے لگا کہ آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں۔ چار سوال تھے، جن کا جواب ہاں یا نہ میں دینا تھا۔ گزیٹڈ افسر خود لکھ کر دیتے اور دوسروں سے دو رکنی کمیٹی جس میں ایک افسر ہندوستان کا اور دوسرا پاکستان کے لیے designated ہوتا، پوچھتے۔ سوالنامہ یہ تھا:

Do you want to serve in India?
Do you want to serve in Pakistan?
Is your decision provisional?
Is your decision final?

جو تیسرے سوال کا جواب ہاں میں دیتے اُن کو چھ ماہ کی مہلت ہوتی جس میں وہ اپنا فیصلہ بدل سکتے تھے۔

سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کے تمام نیوز یونٹ یعنی ہر زبان کے مترجم جس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے وہ ایم ایل چاولہ جو اس وقت ڈائریکٹر آف نیوز کے عہدے پر ترقی پا چکے تھے اور ملک محمد سرفراز جو سب سے سینئر مسلمان نیوز ایڈیٹر تھے اور قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر آف نیوز بنے، پر مشتمل تھی۔ سوال چاولہ صاحب پوچھتے تھے۔ مجھ سے جب اُنہوں نے سوال کیا کہ تم ہندوستان میں ملازمت کرنا چاہتے ہو تو میں نے ہاں یا نہ میں جواب دینے کی بجائے اونچی آواز میں سب کے سامنے پاکستان زندہ باد کہا۔ اس پر چاولہ صاحب نے ذرا جھنجھلا کر کہا: Please answer the question اور میں نے کہا، Please ask it.، پھر ہاں نہ میں جواب ہوئے۔ سرفراز میرے پہلے جواب پر مسکرا دیئے لیکن ماحول میں کوئی کدورت پیدا نہ ہوئی۔ بالآخر وہ مبارک گھڑی آ پہنچی جب میں اپنے تین مترجم ساتھیوں سمیت جن میں شریف حسین آرزو بھی تھے گیارہ اگست کی رات فرنٹیر میل سے لاہور روانہ ہو گیا۔ کالج کے چھ سال لاہور میں ہی گزارے تھے لیکن جس لاہور میں اب جا رہا تھا وہ پاک سرزمین کا نگینہ بن چکا تھا۔